For free urdu novels visit www.asifzamil.net.tc

بقلم خود

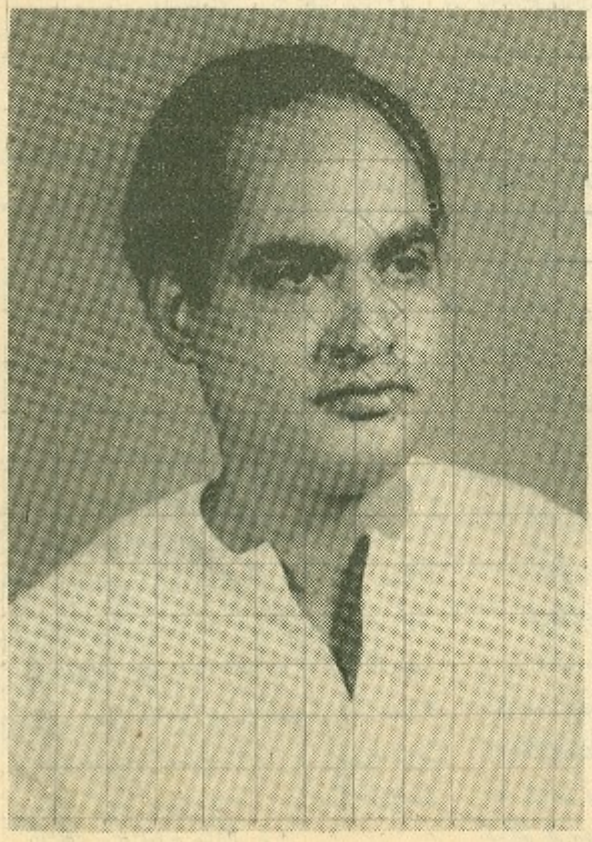

ابنِ صفی

For free urdu novels visit www.asifzamil.net.tc

بچپن میں بقلم خود کی ترکیب نہ جانے کیوں صاحب قلم کی ہی شخصیت کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ مثلاً اگر کہیں "فضل حسین بقلم خود" لکھا ہوا نظر آجاتا تو تصور میں سر فضل کا اور دھڑ ابو کا... گلے میں ہار ڈالے کسی دسنت کی ٹہنی پر براجمان قسم کا نقشہ ابھر جاتا۔

اس زمانے میں یہ عام رواج تھا کسی کو خط بھی لکھتے تھے تو آخر میں اپنا نام لکھ کر بقلم خود ضرور لکھ دیتے تھے۔

بہرحال تشویش ہے کہ "الف لیلہ ڈائجسٹ" کے کرتا دھرتا بھی بقلم خود سے متعلق اسی قسم کا کوئی تصور تو وابستہ نہیں رکھتے۔ اگر اس سلسلے میں ان کی نیت صاف ہے تو پھر وہ سمجھتے ہونگے کہ اس مضمون کے علاوہ میں نے اور کچھ بھی بقلم خود نہیں لکھا، کسی سے لکھوا رہا ہوں۔

پھر سوچتا ہوں۔ شاید بقلم خود سے مراد "خود نوشتہ حالات زندگی" ہو لہذا اسی مفروضے پر مضمون کی ابتدا کرتا ہوں۔

اپریل ۱۹۲۸ء کی کوئی تاریخ تھی اور جمعے کا دن شام کے دھندلکوں میں تحلیل ہو رہا تھا جب میں نے پہلی بار اپنے رونے کی آواز سنی۔ ویسے دوسروں سے سنا ہے، اتنا نحیف تھا کہ رونے کیلئے منہ تو کھول سکتا تھا، لیکن آواز نہیں نکال سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دوسروں کو میری آواز اب بھی نہیں سنائی دیتی، کب سے حلق پھاڑ رہا ہوں.... وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہیں اور پھر بے تعلقی سے منہ پھیر لیتے ہیں.... خیر کبھی تو..... کبھی تو..... اوہو پتا نہیں کیوں اپنے یوم پیدائش کی بات نکلنے پر سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ ع

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جب بھی یہ مصرعہ ذہن میں گونجتا ہے۔ ایک بھاری سی آواز اس پر حاوی ہو جاتی ہے "میاں کس کھیت کی مولی ہو۔ تم نہ ہوتے تب بھی اردو کو سری ادب کے اس دور سے ضرور گزرنا پڑتا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد خواب دیکھنے والا کوئی مسلمان ایک کرنل فریدی ضرور پیدا کرتا۔ کرنل فریدی جو ساری دنیا پر صرف قانون کی حکمرانی کا خواہاں ہے۔"

میں اس آواز کے جواب میں کہتا ہوں "اونہہ.... فنتاسی ذہنیت کا ایک نمونہ میں نے بھی پیش کیا ہے مجھے اس کا اعتراف ہے.... لیکن دنیا میں زیادہ تر یہی ہوتا رہا ہے۔ ہوائی قلعوں ہی نے اکثر ٹھوس حقائق کی طرف رہنمائی کی ہے۔"

لیکن یہ ابھی سے کرنل فریدی کہاں آپہنچے.... ابھی تو میں اپنی تاریخ پیدائش بتا رہا تھا کہ اس کے بغیر "جنم کنڈلی" نہیں بن سکتی۔ (میری صحیح تاریخ پیدائش کسی کو بھی یاد نہیں، لہذا اپنا مستقبل جنم کنڈلی کی مدد کے بغیر ہی بنانا پڑا ہے۔

قصبہ نارہ ضلع الہ آباد یوپی میں ہوش سنبھالا۔ ابتدائی تعلیم قصبے ہی کے اسکول میں ہوئی۔ نصابی کتب کے علاوہ پہلی کتاب جو ہاتھ لگی وہ طلسم ہوشربا کی پہلی جلد تھی۔ ہر چند کہ اس کی زبان آٹھ سال کے بچے کے بس کا روگ نہیں تھی۔ پھر بھی کہانی تو پلے پڑ ہی گئی تھی۔ پے در پے ساتوں جلدیں چاٹ ڈالیں.... پھر یاد نہیں کہ کتنی بار ساتوں جلدیں دہرائی گئی تھیں۔

پہلی کہانی اس وقت لکھی جب ساتویں درجے کا طالب علم تھا اس کا نام "ناکام آرزو" تھا۔ یہ کہانی عادل رشید مرحوم نے اپنے ہفت روزہ رسالے **شاہد** میں شائع کی تھی۔

آٹھویں یا نویں درجے میں پہنچ کر شاعری شروع کی حضرت جگر مراد آبادی حواس پر چھائے ہوئے تھے لہذا **خمریات** میں طبع آزمائی ہوئی اور اس زور و شور سے ہوئی کہ کبھی کبھی سوچا پڑتا کہیں سچ مچ تو نہیں پینے لگا۔ مثلاً:

ہمیں تو ہے مئے گل رنگ و گل رخاں سے غرض
بنائے کفر پڑی کس طرح خدا جانے
بس اتنا یاد ہے اسرار وقت مے نوشی
کسی کی یاد بھی آئی تھی مجھ کو سمجھانے

یا

تشنگی کے لئے خوشبو تے مئے گلرنگ
سہاگ رات میں ہو بوئے پیرہن جیسے

میٹرک میں پہنچتے ہی بے بی کمیونسٹوں کا ساتھ ہو گیا یہ ایسے "بچو لوگ" تھے جنہوں نے کبھی پارٹی آفس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ کھدر پہنتے تھے۔ بال بڑھاتے تھے اور گدڑی بازار (الہ آباد کا جونا مارکٹ) سے آٹھ آٹھ آنے کی پرانی عینکیں خرید لاتے تھے اور کمیونسٹ کہلاتے جانے کے شوق میں اچھی بھلی آنکھوں کا تیا پانچہ کر بیٹھتے تھے۔ بہرحال ان کا ساتھ ہوتے ہی ظالم سماج اور سرمایہ داری

For free urdu novels visit www.asifzamil.net.tc

میری شاعری میں گھس آئے تھے۔ ان دنوں محلے کے بنیے کو سرمایہ دار سمجھتا تھا اور اپنی برادری نظامِ سماج معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ برادری سے باہر شادی کرنے پر سخت ترین پابندیاں عاید تھیں۔ لہٰذا اپنے ہی خاندان کے کچھ بزرگ سماج کے ٹھیکیدار ٹھہرے تھے اور دل ہی دل میں ان پر غرا کر ظالم سماج کے خلاف شاعری کیا کرتا تھا اور جب محلے کا بنیا کسی قرض خواہ سے الجھ پڑتا تو سرمایہ داری کی شامت آجاتی۔ ایسی دل دہلا دینے والی نظم لکھتا کہ بعد میں اس بنیے پر رحم بھی آنے لگتا۔

دوسری عالمگیر جنگ شباب پر تھی اور میں اس الجھن میں پڑا رہتا تھا کہ آخر عالمی امن کا داعی روس کیوں نازی جرمنی کا ساتھ دے رہا ہے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اچانک روس اور جرمنی بھی ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے اور میرے کھدر پوش ساتھیوں نے ہٹلر کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔

میں نے چپ چاپ اپنا کھدر کا سوٹ اتار کر ایک طرف رکھا بال ترشوائے اور آدمی کی جون میں آگیا۔

انٹرمیڈیٹ تک پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا شاعر ہو چکا تھا۔ ایوننگ کرسچین کالج الہ آباد کی رنگین فضاؤں میں کہ شہر کا واحد کوایجوکیشنل کالج تھا یہ ذوق پروان چڑھتا رہا۔

ہوسٹل میں شعر و سخن کی محفلیں جمتیں۔ لیکن فرسٹ ایئر کے سالانہ مشاعرے میں کچھ پڑھنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ سیکنڈ ایئر میں جب بزمِ ادب کی صدارت میرے حصے میں آئی تو کھل کر سامنے آنا پڑا۔

اس سال کے مشاعرے میں میری نظم "بنسری کی آواز" اس حد تک پسند کی گئی تھی کہ میرے ایک استاد مسٹر ہگنس (Mr. Higgins) نے جو انگریزی پڑھاتے تھے اور اردو شاعری سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے دوسرے دن کلاس میں کہا: "فراق صاحب کی رباعیات اور "بنسری کی آواز" کے علاوہ مجھے تو اور سب کچھ (ECHO OF POETRY) (شاعری کی بازگشت) معلوم ہو رہا تھا۔

صدر شعبۂ اردو محترم مولانا انوار الحق صاحب نے فرمایا: "میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ایک دن آپ کا شمار صفِ اوّل کے شعراء میں ہوگا۔"

(میں مولانا موصوف سے شرمندہ ہوں.... وہ آج بھی میرے جاسوسی ناول نویس ہونے پر خوش نہیں ہیں)

۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی پہنچا تو ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے لیکچرز نے ذہنی نشو و نما کے نئے باب کھولے.... فکر و نظر کی تہذیب کرنے کا سلیقہ پیدا ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ مدت بہت قلیل تھی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہو چکے تھے یونیورسٹی میں بھی خنجر زنی کی ایک واردات ہو گئی اور بزرگوں نے میرا یونیورسٹی جانا بند کرا دیا۔ پھر دوسرے سال دوبارہ داخلے کی ہمت اس لئے نہیں پڑی تھی کہ میرے ساتھی فوقتاً ایئر میں پہنچ گئے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں پرائیویٹ امیدواروں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یوپی میں صرف آگرہ یونیورسٹی ایسے طلباء کا واحد سہارا تھی۔ لیکن شرط یہ تھی، کہ امیدوار کو کسی ہائی اسکول میں معلمی کا دو سالہ تجربہ ہونا چاہیئے۔ میں نے سوچا، چلو یہی سہی.. دو سال تک لوگ ماسٹر صاحب ہی تو کہہ لیں گے.... یونیورسٹی میں داخلہ لیکر احساسِ کمتری کا شکار تو نہ ہونا پڑے گا ——— لہٰذا بی اے آگرہ یونیورسٹی سے کیا تھا ———

اسی دوران میں ہم لوگوں نے الہ آباد سے ماہنامہ **نکہت** جاری کیا۔ جس کے موسس عباس حسینی تھے۔ شعبۂ نثر کی ادارت ابن سعید نے سنبھالی اور حصۂ نظم میرے حصے میں آیا... میں نے اس کے لئے طنزیہ مضامین کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا۔ یہ مضامین طغرل فرغان کے نام سے لکھتے تھے۔

میں یہ سب کچھ کرتا رہا۔ لیکن آٹھ سال کا وہ بچہ جس نے طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں چاٹ ڈالی تھیں کسی طرح بھی میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ شعر کہنے بیٹھتا تو سامنے آکھڑا ہوتا۔ نثر لکھتے وقت تو قلم ہی پر ہاتھ ڈال دیتا.... اور پھر میں جھلا کر اس کے پیچھے دوڑ پڑتا۔ اس کا تعاقب کرتا ہوا طلسم ہوشربا کی فضاؤں سے گزرتا۔ اور بالآخر وہ مجھے ایڈیٹر ہیگرڈ کی غیر فانی "ہیتا" کے دربار میں پہنچا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا۔ جیسے میری ساری نثری تخلیقات اجاڑ ویرانوں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں بے چینی بڑھ جاتی بے اطمینانی کی حد نہ رہتی۔ پھر کیا کیا جائے، اکثر سوچتا۔ آخر سرّیت پسندی کے رجحان کی تسکین کیوں کر ہو؟

For free urdu novels visit www.asifzamil.net.tc

پھر ایک دن یہ ہوا کہ ایک ادبی نشست میں کسی بزرگ نے کہا "اردو میں صرف جنسی افسانوں کا مارکٹ ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بکتا"

میں نے کہا "یہ درست ہے لیکن ابھی تک کسی نے بھی جنسی لٹریچر کے سیلاب کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔"

کسی طرف سے آواز آئی "یہ ناممکن ہے جب تک کوئی متبادل چیز مقابلے پر نہ لائی جائے... یہ قطعی ناممکن ہے۔"

"متبادل چیز؟" میں نے سوچا اور پھر وہی آٹھ سال کا بچہ سامنے آکھڑا ہوا جس نے طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں چاٹ ڈالی تھیں اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اسی سال کے بوڑھے بھی بچوں ہی کی طرح طلسم ہوشربا میں گم ہو جاتے ہیں۔

میں نے کہا "اچھی بات ہے، میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ ۵۱ء کے اواخر کی بات ہے جب افسانوی ادب بمشمول ناول میں افسانویت کے علاوہ اور سب کچھ بکثرت پایا جاتا تھا اور ناول میں ناولٹی مفقود تھی۔

میں نے اسی ناولٹی پر زور دیتے ہوئے جاسوسی ناول لکھنے کا فیصلہ کیا۔

جنوری ۵۲ء میں میرے ہی مشورے پر ادارہ نکہت نے ماہانہ جاسوسی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ سلسلے کا نام "جاسوسی دنیا" تجویز ہوا۔ اب تک ایک سو اسی ناول لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے صرف آٹھ جرمنی یا کلی طور پر انگریزی سے ماخوذ ہیں، ورنہ سب طبعزاد ہیں۔

الہ آباد میں صرف سات ناول لکھے تھے اس کے بعد اگست ۵۲ء میں کراچی آگیا تھا۔ بقیہ ناول یہیں لکھے پھر ۵۶ء میں کراچی سے عمران سیریز کے ناول شروع کئے تھے۔

اکثر احباب کہتے ہیں "تم نے طغرل فرغان اور آسرار نارو کو قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔ انہیں زندہ رکھا ہوتا تو آج "ادب العالیہ" میں تمہارا بھی کوئی مقام ہوتا۔"

میں ان سے کہتا ہوں "بھائی، ادب العالیہ کی شمع جلائے پانچ آدمیوں کے حلقے میں بیٹھا نظر آتا... یہی تو مقام ہوتا میرا؟ یا اور کچھ ـــــ؟"

مجھ سے کوئی سلیم جعفری (ایک وسیع النظر صحافی اور باصلاحیت ٹی وی آرٹسٹ) یہ نہ کہتا کہ صمدانی صاحب اردو میری مادری زبان نہیں ہے لیکن آپ جو یہ بامحاورہ اردو مجھ سے سن رہے ہیں، آپ ہی کی کتب کے مطالعے کی رہین منت ہے۔"

سندھ اور بلوچستان اور صوبہ سرحد سے میرے پڑھنے والے مجھے ایسے ہی حوصلہ افزا خطوط بھی لکھتے رہتے ہیں۔"

مجھے اس کے علاوہ اور کیا چاہیئے اور پھر میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں اسے کسی قسم کے بھی ادب سے کمتر نہیں سمجھتا۔ ہو سکتا ہے میری کتابیں الماریوں کی زینت نہ بنتی ہوں، لیکن تکیوں کے نیچے ضرور ملیں گی۔ ہر کتاب بار بار پڑھی جاتی ہے۔ میں نے اپنے لئے ایسے میڈیم کا انتخاب کیا ہے کہ میرے افکار زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچ سکیں۔ ہر طبقے میں پڑھا جاؤں، اور بحمد اللہ میں اس میں کامیاب ہوا ہوں۔

تھکے ہوئے ذہنوں کے لئے صحت مند تفریح مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کچھ کچھ پڑھتے رہنے کی عادت ڈلوائی ہے۔ برصغیر میں لنڈا کی لائبریریوں کا رواج میرے بعد ہی ہوا ہے۔ انہی لائبریریوں میں ادب العالیہ بھی کھپ جاتا ہے۔ جاسوسی ناول پڑھنے والوں کو جب کوئی نیا ناول نہیں ملتا تو ادب العالیہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ لہٰذا ادب العالیہ پیش کرنے والوں کو مجھ پر خار نہ کھانا چاہیئے۔ انہیں تو مجھ پر پیار آنا چاہیئے، کہ ادب العالیہ کی رسائی عوام تک کرانے کا سہرا بھی میرے ہی سر ہے۔

"بقلم خود" اتنا کچھ لکھ دینے کے بعد سوچ رہا ہوں کہ اپنے بارے میں کچھ لکھنا جوئے شیر لانا جان جوکھم کا کام ہے۔ کہاں تک انانیت کو دبایا جا سکتا ہے تھوڑی بہت لاف و گزاف بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے میرا اپنا ہی قول ہے کہ اپنے بارے میں گفتگو کرنے والے اول درجے کے بیوقوف ہوتے ہیں۔ لیکن مجھ سے یہ بیوقوفی سرزد کرائی گئی ہے خود اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔

اچانک ابھی ابھی خیال آیا ہے کہ جب میں یہ مضمون برخوردار ایچ اقبال کے حوالے کر رہا ہوں تو وہ کہیں نہایت سعادتمندی سے یہ نہ کہہ بیٹھیں "جی آپ نہیں سمجھے! بقلم خود کا مطلب دراصل یہ تھا کہ اس مضمون کی کتابت بھی آپ ہی کو کرنی پڑے گی۔"

اللہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔